برق طور یعنی نقد تجلّیات

ازقلم: مولانا سید دلدار علی عرف منّے آغا صاحب رازؔ اجتہادی

(قسط-۲)

اچھا اب ہم سلسلہ روایت کے متعلق جن پانچ تنقیحوں کا وعدہ کر چکے ہیں، ان کو پیش کر کے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا در اصل یہ علامہ نعمت اللہ جزائری کا فیض تھا جس نے ظلمتکدہ ہند کو روشن و منوّر کر دیا، یا صرف غفرآن مآب کے برکات تھے کہ آج ہندوستان والے یہ سمجھ سکے کہ شیعیت کیا ہے اور شیعہ کون ہے، بلکہ یہ معلوم کر سکے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کون ہے۔

پہلی تنقیح

جناب غفرآن مآبؒ کا سلسلہ روایت در اصل نو طریقوں سے جناب نعمت اللہ جزائری تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق ہمیں اس سے زائد کچھ نہیں کہنا ہے کہ جن نو سلسلوں کو جناب مؤلّف نے علامہ نعمت اللہ تک منتھی فرمایا ہے اس کی آخری کڑیاں جن کے ذریعے سے جناب غفرآن مآب کا سلسلہ علامۂ موصوف تک پہنچتا ہے، صرف تین ہیں: ایک جناب آقا ابوالحسن شریف جن کے ذریعہ سے پانچ سلسلے قائم کئے گئے ہیں۔ دوسرے جناب آقا محمد ابن یوسف ابن علی کنباء جن کے واسطے سے تین شجرۂ روایت کے بنائے گئے ہیں تیسرے جناب سید نورالدین صاحب ابن جناب نعمت اللہ جزائری جن کے ذریعہ سے ایک سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ اب چاہے ان سلسلوں کو نو سے تعبیر کیجئے اور چاہے اور کچھ درمیانی وسائط اگر مل سکیں تو ان کے ذریعے سے تعداد میں اضافہ فرمایئے۔

دوسری تنقیح

جو سلسلہ روایت مختلف شجروں کے ذریعہ سے جناب غفرآن مآب کا علامۂ نعمت اللہ جزائری سے ملایا گیا ہے۔ وہ لامحالہ قابل تسلیم وغیر مشکوک ہے یا نہیں ہے۔

اس تنقیح کے اثبات میں مؤلف نے صاحب مستدرک الوسائل وغیرہ کے قول سے تمسک کیا ہے، لیکن محل نظر یہ ہے کہ صاحب مستدرک نے آقا ابوالحسن الشریف کے تعلق روایت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپ آٹھوں طریقوں سے روایت فرماتے تھے۔ اور بالتفصیل ذکر فرمانے میں نو طریقے تحریر فرمائے ہیں۔ مگر صاحب تجلیات نے اس تعداد کو ناکافی سمجھ کر نو (۹) کے گیارہ طریقے ذکر فرمائے۔ اور علامۂ مجلسی جن کا ذکر صاحب مستدرک نے کیا ہے۔ ان کا تذکرہ کسی مصلحت سے ترک فرما دیا ہے۔ اس بنا پر بارہ طریقے ہوتے ہیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ اختلاف بیان ثبوت کو مشکوک کر دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جن علماء نے جناب غفرآن مآب کو اجازہ مرحمت فرماتے ہوئے اپنے سلسلہ کا تذکرہ کیا ہے، ان حضرات نے سلسلہ روایت میں اور علماء کے اسمائے گرامی مندرج فرمائے مگر علامۂ جزائری کا اسم مبارک کسی سلسلے میں مذکور نہیں ہے اور اسی طرح جناب غفرآن مآبؒ نے اپنے صاحبزادے سید العلماء کو اور جناب سید العلماء نے مفتی صاحب کو جو اجازہ مرحمت فرمایا، اس میں بھی کہیں علامہ نعمت اللہ جزائری کا نام مذکور نہیں ہے، جس سے دو باتوں میں سے ایک پر روشنی پڑنا ضروری ہے، یعنی یا تو در اصل سلسلہ روایت میں جناب علامہ موصوف داخل ہی نہ تھے اور اگر تھے تو اگرچہ آپ مدراج علمی میں کیسے ہی بلند مرتبت کیوں نہ ہوں لیکن بیان و نقل احادیث میں آپ اس قدر

قابل اعتنا نہ تھے کہ آپ سے جو سلسلہ جاری ہوا تھا، وہ قابل ذکر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ جو سلسلہ روایت آقا ابوالحسن الشریف کا علامہ موصوف سے ملایا گیا ہے، اس کی انتہا بھی علّامہ مجلسی تک ہوتی ہے۔ اور خود صاحب مستدرک لکھتے ہیں کہ جناب ابوالحسن الشریف بلا واسطہ بھی علامہ مجلسی سے روایت کرتے ہیں۔ لہٰذا جب آقا ابوالحسن شریف بلا واسطہ علامہ مجلسی سے روایت کرتے تھے تو ان کو کیا ضرورت تھی کہ علامہ نعمت اللہ جزائری کے ذریعے سے روایت کریں۔ ان وجوہ سے ہم کو ان تمام سلسلوں میں محل شک وشبہ موجود ہے جن میں علامہ موصوف تک سلسلۂ روایت منتہی ہوکر آگے بڑھتا ہے۔

تیسری تنقیح

اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جناب غفرآن مآبؒ کے شیوخ روایت میں بالواسطہ جناب علامۂ نعمت اللہ جزائری داخل ہیں تو محض سلسلہ مشائخ میں داخل ہونے سے جناب غفرآنمآب کو کوئی فیض علامۂ موصوف سے پہنچا یا نہیں۔

اس تنقیح کی توضیح کے واسطے سب سے پہلے تو ہم یہ کہیں گے کہ کسی کے سلسلہ روایت کا کسی شخص سے متصل ہوجانا اس وقت البتہ اکتساب فیوض وبرکات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس وقت یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بیان روایت کا طریقہ مثل زمانہ سابق اب بھی موجود ہے، یعنی گذشتہ زمانہ میں چونکہ کتب کی تالیف و تدوین نہ ہوئی تھی اس وجہ سے تعلیم احادیث کا ذریعہ صرف اسی میں منحصر تھا کہ استاد سے احادیث سن کر انہیں یاد کرے اور دوسروں سے نقل کرے۔ اسی وجہ سے اجازہ کی ضرورت ہوتی تھی تا کہ دوسروں کو اس شخص کے بیان کئے ہوئے احادیث کا اعتبار ہوسکے۔ لہٰذا اگر یہی طریقہ جاری رہتا تو بیشک اجازے کے ذریعے سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ فلاں شخص مجاز نے اپنے مجیز سے فیض حاصل کیا۔ لیکن جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جناب مفتی صاحب اور جناب سید العلماء اور جناب غفران مآب کی تعلیم میں یہ طریقہ موجود نہیں تھا جس طرح فی الحال موجود نہیں ہے تو پھر محض اجازہ روایت سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ مجاز نے مجیز سے فیض اٹھایا۔ البتہ اگر سلسلہ تلمذ مجاز ومجیز میں موجود ہو تو بیشک فیضیاب ہونا مسلم ہے۔ لہٰذا جو ورق مؤلف نے اس امر کے ثبوت میں صرف کئے ہیں کہ جناب غفرآن مآبؒ کا سلسلہ روایت بذریعہ اجازات روایتی علامۂ نعمت اللہ تک منتھی ہوتا ہے، کاش انہیں اوراق کو وہ اس امر کے ثبوت میں صرف کرتے کہ جناب غفرآن مآب کا سلسلہ تلمذ جناب علامہ نعمت اللہ تک منتھی ہوتا ہے اور یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی مستمسک صحیح موجود ہے کہ اس سلسلہ روایات میں ہر مجاز مجیز کا شاگرد تھا۔

ہم اپنے بیان کی مزید تقویت کے واسطے خود جناب مفتی صاحب کی عبارت نقل کرتے ہیں جس میں آپ نے اجازے کی وقعت اوراق الذھب کے جوہر ثانیہ میں اس طرح ظاہر فرمائی ہے:

”اعلم ان الاجازة هوالاذن فی الروایة دون الاجتهاد والغرض منها اتصال الاسناد و التاسی بالعلماء الا مجاد فقد جرت عادات السادات بها قد بما و حدیثا یجیزو ان ویستجیزو ان۔“

جاننا چاہئے کہ اجازے سے محض روایت کرنے کی اجازت حاصل ہوجاتی ہے اجتہاد کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور اجازے سے صرف اتنی غرض ہوتی ہے کہ سلسلۂ سند متصل ہوجائے اور اجازہ حاصل کرنے میں پیروی ہوجاتی ہے۔ علمائے اعلام کی، کیونکہ کچھ یہ عادت جاری ہوگئی کہ لوگ اجازہ دیتے ہیں اور لیتے ہیں۔ اس عبارت سے واضح ہوگیا کہ اجازہ حاصل کرنا صرف اس لئے ہوتا ہے کہ سلسلہ روایت مل جائے اور عادت جاریہ پر عمل ہوجائے اس سے زائد کچھ نہیں۔ چنانچہ اس کی بین مثالیں یہ ہیں کہ بعض علماء نے ایسے بچوں کے واسطے اجازہ تحریر فرمایا ہے جو ابھی گہوارے سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ صاحب مستدرک الوسائل لکھتے ہیں کہ جناب شیخ علم الھدی ابو غالب زراری نے اپنے پوتے کے واسطے جو شیر خوار تھے اجازہ لکھ کر رکھ دیا تھا۔ جہاں اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوئی

کہ اجازہ محض اتصال سلسلہ روایت ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایک کا دوسرے کے واسطے شاگرد ہونا اور اس سے فیض اٹھانا اجازہ دینے یا لینے میں ضروری نہیں ہے ۔ دور کیوں جایئے ہمارے شہر کے رکن ملّت جناب نجم العلماء دامت برکاتہ کو ملاحظہ فرمایئے کہ سرکار موصوف نے جناب سید کاظم طباطبائی اعلی اللہ مقامہ سے اجازہ حاصل فرمایا۔ اور ان جناب کی رحلت کے بعد جناب سرکار سید ابو الحسن اصفہانی دامت برکاتہ سے استجازہ فرمایا۔ لیکن جناب نجم العلماء مدظلہ نے ایک حرف بھی حضرات موصوفین سے نہیں پڑھا۔ اور نہ آپ کا سلسلۂ تلمّذ ان حضرت تک پہنچتا ہے یا جناب ممتاز العلماء اعلی اللہ مقامہ کو علمائے عراق نے اجازات مرحمت فرمائے۔ حالانکہ جناب ممتاز العلماء نے سفر عراق تک نہ فرمایا تھا اور نہ علمائے عراق کی زیارت کی۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ محض اجازہ حاصل کرنا سلسلہ تلمّذ قائم کردیتا ہے اور اجازہ دینے والوں کے فیوض علمی مجاز تک پہونچ جاتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ محض اجازہ حاصل کرنے سے شاگردی اور استادی قائم ہوجانے کا وہم بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جن بزرگ نے ایک شخص سے اجازہ حاصل کیا انہیں بزرگ سے خود اجازہ دینے والے نے بھی اجازہ حاصل کی اور اسے علم درایت میں تجازی کہتے ہیں۔ چنانچہ جناب حر عاملی جناب علامہ مجلسی سے بطریق اجازہ روایت فرماتے ہیں۔ اور جناب مجلسی جناب حر عاملی سے بذریعہ اجازہ روایت فرماتے تھے۔ اسی طرح جناب سید نصر اللہ جناب سید عبد اللہ سے اور خود سید عبد اللہ سید نصر اللہ سے روایت فرماتے تھے۔ مگر مؤلف **تجلیات** نے خدا جانے کس مصلحت سے جناب غفرآن مآب کا سلسلہ روایت علامۂ جزائری سے ملاتے ہوئے جناب سید نصر اللہ کا روایت کرنا قابل ذکر نہ سمجھا۔ ممکن ہے کہ مؤلف نے خیال کیا ہوگا کہ تذکرہ تجازی اس سلسلہ کو کمزور کردے گا، جس کے ذریعے سے جناب غفرآن مآب کا سلسلہ علامہ نعمت اللہ تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک طریقہ روایت اقران کا بھی ہے، جس سے مطلب یہ ہے کہ دو ایسے ہم پلّہ اور معاصر اشخاص جو اخذ بالشیخ میں متحد ہوں آپس میں ایک دوسرے سے روایت کریں چنانچہ نور الدین علی اور ان کے مادری بھائی شیخ حسن صاحب **معالم** اور ان کے پدری بھائی صاحب **مدارک** نے سید علی ابن حسین سے ساتھ اخذ کیا اور آپس میں ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔

بلکہ اگر ہم مان لیں کہ ابو الحسن شریف نے علامہ نعمت اللہ جزائری سے روایات نقل کیئے تو وہ بھی در اصل روایت اقران ہوگی، کیونکہ دونوں نے علامہ مجلسی سے اخذ کیا تھا اور پھر ایک دوسرے سے روایت بھی کرتے تھے۔

بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف اجازے کے ذریعہ سے مجاز کا کم منزلت اور مجیز کا بلند مرتبہ ہونا بھی نہیں ثابت ہوتا۔ کیونکہ علم درایت میں ایک طریقہ تحمل روایت کا یہ بھی ہے کہ بزرگ اپنے خورد سے اجازہ حاصل کرے۔ چنانچہ بنا بر تصریح صاحب **مستدرک الوسائل** جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ جناب شیخ صدوق علیہ الرحمہ سے روایت کرتے تھے، حالانکہ خود صاحب **مستدرک** نے جناب شیخ مفید کو شیخ صدوق سے اعلم تصور کیا ہے۔ بلکہ بعض مقامات ایسے بھی ملتے ہیں جہاں باپ بیٹے سے روایت کرتا ہے۔ لہٰذا مولف **تجلیات** کا صرف جناب غفرآن مآب کے سلسلہ روایت میں علامہ جزائری کو داخل بنا کر سلسلہ تلمذ سے پہلو تہی کرجانا اس بات کو ثابت نہیں کرسکتا ہے کہ جناب غفرآن مآب کی شاگردی کا سلسلہ علامہ موصوف تک پہنچتا ہے جس کے ثبوت کے بغیر جناب غفرآن مآب کا علامہ موصوف سے مستفیض ہونا باطل ہے اور نہ جناب غفرانمآبؒ کو علامہ موصوفہ سے کسی طرح کم ثابت کرسکتا ہے۔

چوتھی تنقیح

اگر بفرض محال سلسلہ تلمذ مان بھی لیا جائے اور یہ ثابت بھی ہوجائے کہ سلسلہ روایت جناب غفرآن میں یہ مجاز اپنے مجیز کا شاگرد تھا، تو کیا یہ درست ہوگا کہ شاگرد کے ہر کارنامہ کو استاد کی

طرف منسوب کیا جائے یا نہیں۔

اولاً تو ہم اسے تسلیم نہیں کرتے کہ شاگرد کے جس قدر فیوض ہوں، وہ سب دراصل استاد کے ہیں، کیونکہ اکثر امور ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو شاگرد محض اپنی ذہانت وذکاوت سے حاصل کرتا ہے اوران میں تعلیم استاد کو مدخلیت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے کلیتہً قابل نظر ہے اور بالخصوص جناب غفران مآب کے واسطے ہم بہت زور سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا علمی کارنامہ اگر آپ کے اساتذہ کے فیوض سے تعبیر بھی کیا جا سکے تو بھی آپ کے عملی کارنامہ پر باراحسان سے سبکدوش تھے۔ یعنی یہ مسلم ہے کہ علم و عمل دونوں چیزیں اگر چہ اعتبار حکمی سے ایک بھی کیوں نہ ہوں لیکن دراصل دوالگ چیزیں ہیں اور جناب غفرآن مآب کا علم اگر چہ اساتذہ کرام کا فیض تھا لیکن ان کا عمل خاص مرحمت خالق تھی اوراگرچہ یہ نا قابل انکار ہے کہ جناب غفرآن مآب کو وہ فضیلت علمی حاصل تھی جس نے ان کو استادالاساتذہ بنا چھوڑا لیکن پھر بھی ان کا شرف خاص اور وہ فضیلت جس نے ان کو مجدد ملّت کہلوادیا ان کا عمل تھا۔ اسی عمل کے ذریعہ سے جناب موصوف نے تعلیم کی طرف توجہ کی اور اسی عمل کے ذریعے سے اکتساب علم کیا اور اپنی قوت فعلی ہی سے ان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ جہالت میں علم اورضلالت میں رشد اور کفر میں اسلام اور نفاق میں ایمان کا نور پھیلا سکے۔

یہ قوت عملی ہی کا زور تھا کہ اپنی قوم کی حالت پرنظر کر کے بچپنے میں وطن چھوڑا، تحصیل علم کے واسطے ہندوستان کی خاک چھان کر عرب وعجم کی بادیہ پیمائی کی، درس وتدریس، تصنیف و تالیف، وعظ ونصیحت کر کے ہندوستان والوں کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر نور ہدایت تک پہنچایا۔ آج اگر دنیا والے انصاف کی نگاہوں سے دیکھیں گے تو انھیں ماننا پڑے گا کہ صاحبان دولت وثروت آثار تدین سے بعید ہیں۔ لیکن خدا جانے جناب غفرآنمآب اور ان کی اولاد کرام میں کون سی زبردست روحانیت موجود تھی کہ عام روساء کے علاوہ خود شاہان اودھ تک محض ان کی روحانیت سے متاثر ہو کر وہ کام کر گئے جو آج تک اکتساب اجر کا باعث اور پرورش خلق کا ذریعہ ہیں۔

دہلی کے زبردست شاہی ایوان کیا علماء اسلام کی وعظ و نصیحت یا ان کے قدوم کی رسائی سے باہر تھے؟ ہرگز نہیں، مگر آج تمام ہندوستان میں کسی بادشاہ کے ایسے اعمال باقیہ مثال میں پیش نہیں کئے جاسکتے جیسے شاہان اودھ کر گئے۔

خدا ان کے مدارج عالی کرے کہ ان کی رحلت کر جانے کے بعد بھی آج ان کی طرف سے مجالس کی بنا، محافل کا انعقاد ہوتا ہے۔ عزاداری اس پیمانہ پر ہے جو دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ شفا خانے انگریزی اور یونانی ہر قسم کے افراد کے واسطے فیض رساں ہیں۔ ہر سال سیکڑوں زائر عتبات عالیات عراق و خراسان کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔ کم سے کم ہر سال ایک شخص حج کرتا ہے۔

سینکڑوں غرباء طلبہ علمائے عراق میں ماہ بماہ خیر یہ اودھ سے پرورش پاتے ہیں۔ ایک مدرسہ سلطان المدارس ہی شاہان اودھ کا وہ زرّیں عمل ہے جس نے علم کے دریا تمام ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلا دیئے۔ ان تمام امور کے علاوہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت لکھنؤ میں کئی ہزار آدمی سالانہ کسی نہ کسی طرح اوقاف شاہان اودھ سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہ تمام آثار اس خاندان اجتہاد کے علماء کی زبردست روحانیت کا نتیجہ ہیں کہ ان حضرات نے بادشاہوں تک کے دل امور ایمانی کی طرف مائل کر دیے تھے۔ اگر ہم ان کارناموں کی تفصیل کریں جو جناب غفران مآب اوران کی اولاد امجاد نے کئے تو ایک طویل کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ ہمارا مطلب اصلی نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو تو صرف یہ بتانا ہے کہ صرف علم جناب غفران مآب کے واسطے باعث ان تمام فضیلتوں کا نہ تھا، بلکہ ان کا عمل جو اساتذہ کے فیض سے سبکدوش تھا، وہ اس بات کا سبب ہوا کہ جناب غفرآن مآب کو اس منزلت بزرگ پر فائز سمجھا جائے جہاں علمائے اعلام میں معدود چند حضرات نظر آتے ہیں۔ اس لئے آنجناب کے

فیوض و برکات کو نہ ان کے اساتذہ کی طرف پلٹایا جاسکتا ہے اور نہ درحقیقت ان فیوض میں ان کے اساتذہ میں سے کوئی ان کا شریک و سہیم تھا۔ جناب غفرآن مآبؒ کے جنبۂ عمل کا تذکرہ جناب مفتی صاحب ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اوراق الذہب: **الیٰ ان وصلت التوبه الی السید الجلیل الاوحدی الاحوذی السید دلدار علی اعلی اللہ مقامه فی یوم القیمة فقام عماد الاسلام بعضده وانقنی الصوارم والحسادم بیده۔** اور اسی قدر ہمارے بیان کے اثرات میں کافی ہے ثانیاً یہ کہ اگر جان بھی لیں کہ جناب مؤلف تجلّیات کا یہ کلیہ درست ہے کہ ہر شاگرد کے فیوض خود اس کے نہیں ہیں بلکہ اس کے استاد کے ہیں، تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جناب غفرآن مآبؒ کے اساتذہ اور علامہ نعمت اللہ کے فیوض کا تذکرہ کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ ان حضرات کے علوم وہبی اور ذاتی تھے، تو بیشک فیوض و برکات ان کی ذات کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ علامہ جزائری نے بھی کسی سے تعلیم حاصل کی تھی، تو مؤلف تجلیات کے کلیہ کی بنا پر کسی خاص فضیلت کا علامہ جزائری کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ بلکہ جو کچھ فیض پہنچا وہ ان کے اساتذہ کا تھا۔ اور ان کے اساتذہ بھی کسی کے شاگرد تھے۔ اس وجہ سے ان کی طرف بھی فیض رسائی کی نسبت غلط ہے۔ اور آخر میں یہ سلسلہ ائمہ بلکہ رسول اور خدا تک منتہی ہوتا ہے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ جناب غفرآن مآب کے تذکرہ میں ان کے فیوض کو اساتذہ کی طرف پلٹایا جاتا ہے۔ لیکن جناب مفتی صاحب کے تمام فیوض کو ان کے اساتذہ کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ خود مؤلف **تجلیات** علامہ جزائری کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اور آپ نے تعلیم و ہدایت میں بڑی بڑی زحمتیں اٹھائیں اور اس جہلستان میں ہدایت کی شمعیں روشن کیں، یہاں تک کہ اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے حیوانات کا ذبح کرنا سب کو سکھایا۔''

اگر دراصل یہ کلیہ صحیح ہے کہ شاگرد کا ہر کارنامہ استاد کی طرف منسوب کیا جائے تو بہتر تھا کہ مؤلف **تجلیات** علامہ جزائری کی جگہ ان کے اساتذہ کا تذکرہ فرماتے۔ اور آگے بڑھ کر علامۂ جزائری کے مصنفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہت سے کتب و رسائل تصنیف فرمائے جو آج تک عالم میں فیض پہنچا رہے ہیں۔''

محترم مؤلف بہتر ہوگا کہ اس فیض کو علامہ کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ ان کے اساتذہ حر عاملی، باقر مجلسی، ملا حسن کاشانی، آقا حسین خوانساری وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کی طرف منسوب کریں۔

ہمارے اس بیان سے ناظرین بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بالکل غلط ہے کہ شاگرد کا ہر عمل استاد کے برکات سے تعبیر کیا جائے۔ کیا یہ کوئی صاحب عقل قبول کرلے گا کہ مدرسۂ ناظمیہ سے جو اثرات پھیل رہے ہیں، وہ دراصل جناب نجم الملۃ دامت برکاتہ کے نہیں ہیں بلکہ ان کے اساتذہ کرام جناب مولانا بچھن صاحب مرحوم اور جناب مولانا ابو صاحب مرحوم کے ہیں یا کون صاحب ہوش مان سکتا ہے کہ **عبقات الانوار** سے جو فیض رسانی ہو رہی ہے، وہ جناب مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ مرحوم کی طرف منسوب نہ ہونا چاہئے۔ اور اگر یہ نسبت درست نہیں ہے تو پھر ماننا ہوگا کہ جناب غفرآن مآب کے فیوض و برکات بھی انہیں کے تھے، دوسرے کے نہ تھے۔ اور یوں ہی جس عالم نے جو دینی خدمت کی ہو، وہ مخصوص اس کی طرف منسوب ہونے کے قابل ہے اس وجہ سے انصاف پسند طبقہ یہ نہیں کہتا کہ **روائح القرآن** جناب سید العلماء کی تھی اور **عبقات الانوار** کو خاندان اجتہاد کی تالیفات کے سلسلہ میں مندرج ہونا چاہئے۔ بلکہ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ صرف اس بنا پر کہ صاحبان علم کا زائد طبقہ خاندان اجتہاد کے شاگردوں کی فہرست میں منسلک ہے اور اس خانوادہ بزرگ کی رہنمائی کا ممنون احسان ہے۔

پانچویں تنقیح

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ جناب غفرآن مآبؒ کے فیوض و

برکات میں علامۂ جزائری کے فیوض و برکات شامل تھے، تو جناب مفتی صاحب کو علامۂ جزائری کا فیض پہنچا یا نہیں، اس تنقیح کے متعلق ہم کو صرف اس قدر کہنا ہے کہ اگر دراصل کوئی فیض علمائے عراق میں علامہ جزائری کا موجود تھا، تو وہ بہت ہی قلیل تھا، جس کا ہست و بود برابر تھا۔ کیونکہ ہم سابقاً ذکر کر چکے کہ علامہ ابوالحسن شریف آٹھ عالموں سے اور بقول مؤلف تجلّیات گیارہ بارہ عالموں سے روایت کرتے تھے جن میں سے ایک علامہ جزائری بھی تھے۔ لہٰذا خود جناب شریف ہی میں اگر بہت زائد فیض علامہ جزائری کا قابل تسلیم ہوسکتا ہے تو بقدر ایک ثمن کے اور پھر ہر واسطہ میں وسائط روایت سے دیگر علماء کے آثار شریک ہونے کی وجہ سے یہ فیض اور بھی مضمحل ہوگیا، جو شاید بقدر عشر عشیر بھی باقی نہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جناب غفران مآبؒ میں علامہ جزائری کے برکات کا شائبہ بھی نمایاں نہ ہوا کیونکہ علامہ جزائری کا مسلک اخباریت تھا اور جناب غفرآن مآب نے اپنے تصانیف میں اخباریت کا قلع قمع کردیا۔ اگر اس کے بعد بھی علامہ موصوف کا فیض جناب غفرآن مآب میں موجود تھا، تو اس کو دیکھنے کے واسطے ہماری آنکھیں اس وقت تک ناکافی ہیں جس وقت تک مؤلّف تجلیات کی عینک موجود نہ ہو۔ اور اگر بر سبیل تنزل ہم مان بھی لیں کہ نہیں جناب غفرانمآبؒ میں کچھ نہ کچھ برکات جزائر ضرور موجود تھے تو پھر ہمیں جناب غفران مآب کی قوت تحیز یہ کی داد دینا ہوگی کہ بقول مؤلّف تجلیات آنجناب نے اپنے فرزند کے ذریعہ سے جناب مفتی صاحب تک محض انھیں کے جد بزرگوار کے فیوض پہنچا دیئے جو عشر عشیر بھی نہ تھے اور اپنے تمام اساتذہ کرام میں سے چھانٹ کر صرف جناب مفتی صاحب تک ایک ہی اثر پہنچا دیا۔ اور خود جناب مفتی صاحب کی نگاہ نقاد نے اموال اغیار کو چھوڑتے ہوئے صرف اپنے ہی جد بزرگوار کے متروکہ پر قبضہ کرلیا۔

مگر افسوس تو اس کا ہے کہ جناب مؤلّف نے یہ بھی ملاحظہ نہ فرمایا کہ جناب علامہ جزائری اخباری تھے اگر ان کا فیض مفتی صاحب تک پہنچتا تو یہ بزرگ بھی اخباری ہوتے لیکن غضب یہ ہوگیا کہ جناب مفتی صاحب کے اصولی المسلک ہونے نے مؤلف کی عمارت خیالی کو بیخ دین سے اکھاڑ پھینکا۔

ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

نیز اس مقام سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر مؤلّف کا یہ قول درست ہوتا کہ علامہ جزائری کے فیوض و برکات بھی ہندوستان کی علمی رگوں میں خون کی طرح پھیلے ہوئے ہیں تو آج اخباریت اصولیت پر غالب ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اور جب یہ نہیں ہے تو تسلیم فرمائیے کہ علامہ جزائری کا فیض نہیں پہنچا والاّ غضب ہوتا۔

ہمیں اس باب کو ختم کرتے ہوئے یہ کہنا ناگزیر ہے کہ استاد چاہے ہم مذہب ہو یا غیر مذہب لیکن اس کی قدر کرنا شاگرد پر فرض ہے۔ مگر مؤلّف نے ایک فرضی کلیہ بنا کر حقیقی کلیہ کو نظر انداز کردیا کیونکہ علامہ جزائری کے ان فیوض کو، جو سات سمندر پار سے ناکھتے پھاندتے ہندوستان آئے تھے، قابل ذکر سمجھا۔ مگر جناب مفتی صاحب کے استاد مولوی عبدالقوی وعبدالقدوس و قدرت علی کے فیوض کا تذکرہ نہ فرمایا جن کی تعلیم نے جناب مفتی صاحب کو اس قابل کردیا کہ وہ جناب سید العلماء کے سے عالم جلیل کے حلقہ درس میں حاضر ہونے کے قابل ہوئے۔ انصاف تو یہی تھا کہ جب جناب غفران مآب کے برکات میں علامہ جزائری کے فیوض شامل بتائے گئے تو جناب مفتی صاحب کے برکات میں ان کے اساتذہ موصوفین بالا کے فیوض کی شرکت تسلیم کی جائے اور جناب مفتی صاحب کے برکات کی نسبت مولوی عبدالقدوس کی طرف تسلیم کی جائے۔ **فتدبرو ولا تکن من الناقلین۔**

ہماری مندرجہ بالا تحقیق کے بعد جس طرح یہ امر قابل یقین ہے کہ علامہ جزائری کا کوئی فیض ہندوستان میں موجود ہے، اسی طرح یہ امر بھی قابل شک ہے کہ جناب مفتی صاحب کو اپنے خاندان کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کا موقع ملا، بلکہ جو کچھ تھا اور ہے وہ جناب غفرآن مآب کے اور ان کے خاندان کا

فیض ہے۔ جوتقریباً ہر رگِ علم میں خون کی طرح موج زن ہے اوراس گھرانے کی برکت ہے جس نے ایمان کے ویران گھروں کو آباد کردیا۔ فذکر ان نفعت الذکری۔

جناب مفتی صاحب کی عربی انشاء پردازی

جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے مشاغل زندگی کو ذکر کرتے ہوئے چوتھے باب میں مؤلّف تجلّیات نے مدح میں حدغلو سے بھی کچھ اور زیادہ بلند ہوتے ہوئے اس بات کی کوشش کی ہے کہ خاندان اجتہاد کے علوء منزلت کو گھٹا کر کم از کم ادبیت ہی میں اپنے ممدوح سے کم کردیں مگر ہمیں اس بات میں مؤلف سے گہری ہمدردی ہے کہ آپ کواس کوشش میں بھی ناکامی ہوئی جیسا کہ ہم ابھی ابھی ثابت کریں گے۔ مگر پہلے ہم تجلیات کی عبارت بلفظہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں:

> ''چونکہ جناب مفتی صاحب عربی زبان دانی اورفنون ادبیہ اورتحریر نظم ونثر میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔''
>
> ''اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی''
>
> نتیجہ یہ ہوا کہ جوخطوط عراق عرب وعجم سے سلطان العلماء کے پاس آتے تھے اور شاہی عطیات کے سبب سے کربلا ونجف کے علماء کی تحریریں ان حضرات کے پاس برابر آتی تھیں، ان کا جواب لکھنے والا مفتی صاحب کے سوا کوئی دوسرا شخص لکھنؤ میں بلکہ ہندوستان میں نہ تھا۔ تحریر خطوط میں مفتی صاحب کا طرزعمل یہ تھا کہ کسی خط میں اپنے نام کا اشارۃً وایماتک نہ کرتے تھے۔ بلکہ سلام بھی تحریر نہیں کیا۔ کبھی یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ عبارت رنگین کسی دوسرے کے قلم کا نتیجہ ہے''۔

اس عبارت میں جومختلف فقرے اپنے اپنے محل پر مفہوم اصلی کا لحاظ کرتے ہوئے صرف کئے گئے ہیں اس سے چند باتوں کا ہر ناظر سلیم الفہم کے دماغ میں آنا ضروری ہے جن کو ہم بالتفصیل درج کرتے ہیں:

(۱) انشاء پردازی میں جناب مفتی صاحب عدیم المثال تھے۔

(۲) اس ادبیت سے آپ پر بلا نازل ہوئی۔

(۳) خطوط عراق کا جواب جناب موصوف کے سوا کوئی نہ دے سکتا تھا۔

(۴) جو خطوط سلطان العلماء اور سید العلماء کے پاس آتے تھے، وہ شاہی عطیات کی وجہ سے تھے۔

(۵) جناب مفتی صاحب کا طرزعمل یہ تھا کہ اپنے نام کا ایما نہ کیا تاکہ علمائے خاندان اجتہاد کی فضیلت ظاہر ہو اور اپنا نام نہ ہو۔

لیکن اصل یہ ہے کہ جس قدر شبہات پیدا کئے گئے ہیں وہ تخیلات باطل سے زائد باوقعت نہیں ہیں۔ اور یقینا روئے حقیقت بے نقاب ہونے کے بعد ہر شخص ان وساوس کے پادرہوا ہونے کو تسلیم کرلے گا۔ اس لئے ہم ان تخیلات کی واقعیت پر نگاہ تفصیلی ڈالنا ضروری جانتے ہیں۔

پہلے وسوسہ کا جواب

اس میں شک نہیں کہ جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ کو انشاء پردازی میں کافی مہارت تھی اور اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ آپ بے نظیر تھے تو جو کچھ ادبیت کی منزلت ہے وہ ہماری تمہید پر نظر کرنے سے بخوبی واضح ہوجائے گی۔ اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ جناب مفتی صاحب اس فن کو اپنے اساتذہ سے زائد جانتے تھے، تو بعینہ یہ ایسا ہوگا جیسے کسی عالم کا نگینوں کے جڑاؤ سے واقف نہ ہونا۔ اور کسی جوہری کا کسی مجتہد پر فخر کرنا کہ میں آپ سے افضل ہوں۔ اور یہ بھی اس وقت ہے کہ جب ہم افضل ہونا علوم ادبیہ میں تسلیم کرلیں۔ حالانکہ یہی ناقابلِ تسلیم ہے۔ اولاً تو اس وجہ سے کہ جناب مفتی صاحب خود فرماتے ہیں کہ میرا قلم اور زبان آپ کی تعلیم سے ادائے مطلب کے قابل

ہوئے جیسا کہ اصل عبارت ہم سابقاً ذکر کر چکے۔ ثانیاً یہ کہ خود جناب مفتی صاحب اوراق الذھب میں جناب سید العلماء کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے بعض تلامذہ کے متعلق مدح سراء ہیں کہ ان کو علوم ادبیہ میں مہارت حاصل تھی۔ ملاحظہ ہو (اوراق الذھب تذکرۃ تلامذہ) اس لئے یہ شبہ بھی شبہ بعدوم النظیر سے زائد باوقعت نہیں ہے۔

دوسرا وسوسہ اور اس کا جواب

یہ خیال بھی محض گمان باطل ہے کہ اس ادبیت سے آپ پر بلا نازل ہوئی، کیونکہ اگر صرف تحریر جواب کی مشقت کو بلا سے تعبیر کیا گیا تو اس کی صحت میں کلام ہے، اولاً تو اس وجہ سے کہ کبھی کبھی چند کلمہ لکھ دینا، اس میں مشقت ہی کون سی تھی، جس کو بلا سے تعبیر کیا جائے۔ ثانیاً یہ کہ فی الواقع اگر عبارت بنانے میں جناب مفتی صاحب کو مشقت شاقہ بھی گوارا کرنی پڑتی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ بڑی جفا کشی اور دقت سے ایک خط کا جواب تحریر فرما سکتے تھے تو بھی حقوق استاد کے مقابل میں اس مشقت کو بلا سمجھنا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جناب مفتی صاحب کے خیال میں بھی نہ گذرا ہوگا۔ البتہ مؤلف تجلّیات جو یقینا جناب مفتی صاحب کی تالیف تاریخ کو اپنے واسطے بلا سمجھتے ہوں گے، تحریر جوابات کو مفتی صاحب کے واسطے بلا سمجھے۔ ثالثاً یہ کہ مشقت و زحمت اگر بے ثمر ہو تو بے شک بلا کہے جانے کی مستحق ہے، لیکن اگر کوئی تکلیف خفیف منافع کثیرہ اپنے دامن میں لئے ہو تو اس کو بلا کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایمان میں کمزور صوم کی زحمت کو بلا اور نماز کی تکلیف کو مصیبت سے تعبیر کرے۔ لیکن اگر روزہ کی تکلیف تعمیل حکم منعم کی وجہ سے اور اجر اخروی کے خیال سے بلا نہیں کہی جا سکتی تو تحریر جواب خطوط کی زحمت کو بھی بلا نہیں کہا جا سکتا بسبب اس کے کہ اس میں بھی تعمیل ارشاد منعم تھی۔ بلکہ دراصل یہی جناب سلطان العلماء اور سید العلماءؒ کا وہ طریقہ تعلیم تھا جس کے باعث سے جناب مفتی صاحب ادبیت میں بے نظیر کہے جا سکے کیونکہ فطرت انسانی کا تقریباً یہ خاصّہ مسلمہ ہے کہ اگر وہ کسی شخص سے خط لکھواتا ہے تو ہرگز بھی یہ نہیں ہوتا کہ کاتب جو چاہے، وہ لکھ کر مکتوب الیہ کو روانہ کردے اور جس شخص نے خط لکھوایا ہے وہ مکتوب کو نہ دیکھے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ مفتی صاحب جواب خط لکھنے کے بعد جناب سلطان العلماء اور سید العلماءؒ کی خدمت میں بطریق ملاحظہ و اصلاح پیش کرتے تھے۔ اور یہ حضرات ان خطوط کو ملاحظہ فرماتے تھے اور جگہ جگہ اپنے قلم مبارک سے اصلاح بھی دیتے تھے۔ اور یہی ذریعہ تھا کہ جس کے بعد جناب مفتی صاحب کی مہارت بڑھی اور اس کے شاہد جناب مفتی صاحب کے وہ فقرات ہیں کہ جن کو جناب مفتی صاحب ادبیت کے ثبوت میں تحریر کرتے ہیں۔ چنانچہ اوراق الذھب میں فرماتے ہیں کہ:-

واللسان والقلم قد جریانی تبیین مقالی بتعلیمک۔

یا دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کو جناب سید العلماء کی ادبیت دیکھنا ہو وہ مجھے دیکھے فانا أیة من أیاته و رایة من رایاته کیونکہ اگر ان فقرات کو ہمارے مندرجہ بالا مطلب کا شاہد نہ قرار دیا جائے تو شاید یہ وہ فقرے ہوں گے جن کا مصداق ملنا ناممکن ہوگا۔

اس کے علاوہ اگر علمائے خاندان اجتہاد یہ طریقہ نہ اختیار کرتے تو ایک گوشہ نشین کو ایسے زبردست اہل زبان سے خط و کتابت اور ان کے اصول تحریر دیکھنے اور جوابات لکھنے کا موقع کہاں ملتا؟

رہا یہ دعویٰ کہ خطوط عراق کا جواب موصوف کے سوا ہندوستان میں کوئی نہ دے سکتا تھا، اس کی مہملیت واضح ہے، کیونکہ جب یہ معلوم ہو چکا کہ جناب مفتی صاحب کے تمام کمالات جناب سید العلماءؒ کی تعلیم کا نتیجہ تھے تو یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ وہ حضرات ان خطوط کے جوابات جناب مفتی صاحب سے بدرجہا بہتر تحریر فرما سکتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر خطوط کا املا وہی حضرات فرماتے تھے۔ اور کتابت جناب مفتی صاحب سے متعلق ہوتی تھی اور اسی سے جناب مفتی صاحب کو خطوط لکھنے

کی مہارت پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ ابھی جناب جنت مآب کے کتب خانہ میں وہ خطوط موجود ہیں جو سلطان العلماء وغیرہ نے خطوط عراق کے جواب میں اس وقت تحریر فرمائے تھے، جب جناب مفتی صاحب کو کمسنی کی وجہ سے یمین ویسار کی بھی شناخت نہ تھی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تحریر جواب کا کام مفتی صاحب کے سپرد صرف اسی طرح کیا گیا جس طرح ہر سلطنت دینی و دنیوی میں ایک عہدہ کتاب کا ہوا کرتا ہے۔ بڑے لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اپنے ہاتھ سے خطوط کے جوابات لکھا کریں؟ افسوس کہ مولف **تجلیات** تاریخ ملاحظہ فرمانا عبث سمجھے والّا ان کو تسلیم کرنا پڑتا کہ تحریر کی خدمت کسی متوصل بارگاہ سے لینا عجز کی دلیل نہیں ہے۔ اور اگر یہ ہوتا تو شاید صلح حدیبیہ کا مسودہ لکھ دینا علیؑ کو رسولؐ پر فضیلت دے دیتا۔ بلکہ اگر آپ بارگاہ رسالت کے قواعد و ضوابط دیکھئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرتؐ نے کبھی کوئی تحریر اپنے دست مبارک سے نہیں لکھی اور ہر تحریر ایک خاص کاتب کے سپرد تھی۔ چنانچہ عبداللہ ابن ارقم ارباب ریاست کو آپ کی طرف سے خطوط لکھتے تھے۔ علاء ابن عقبہ قبالون کے لکھنے کے واسطے مخصوص تھے۔

زبیر ابن عوام اور جہم ابن صلت صدقات کی فہرستیں مرتب کرتے تھے۔

حذیفہ حرسون کی درآمد لکھنے پر مامور تھے۔

علی بن ابی طالبؑ کتابت وحی واحادیث فرماتے تھے۔

اگر اس فہرست کو دیکھتے ہوئے کوئی نافہم یہ کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا کاتب خود آنحضرتؐ سے زائد مہارت رکھتے تھے، تو یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ جناب سید العلماء اور سلطان العلماء چونکہ علمائے عراق کے خطوط کا جواب نہ لکھ سکتے تھے، اس وجہ سے جناب مفتی صاحب اس کام کو انجام دیتے تھے۔ رہا یہ خیال کہ ہمارے رسول امی تھے تو کہیں گھبرا کر یہ اعتقاد کر بھی نہ لیجئے گا کہ بعد بعثت بھی آپ ان پڑھ ہی رہے والّا اس صفت میں آپ پر امت والوں کو فضیلت ہوجائے گی بلکہ امی کے معنی ساکن ام القریٰ۔ ملاحظہ ہوں علماء کے اعتقادات اور تفسیر۔

اگر کوئی بزرگ یہ فرمائیں کہ معصومینؑ کی مثال گروہ غیر معصوم سے نہیں مل سکتی ہے تو اولاً تو عدم امکان بعد حکم تاسی بالرسول بقدر امکان کے غیر مسلم ہے۔ ثانیاً یہ کہ اگر ہم اس کی نظیر آپ ہی کی **تجلّیات** میں پیش کردیں تو مانیئے گا؟ اچھا ملاحظہ ہو جلد دوم صفحہ ۲۰۷ر جناب نجم الملۃ مدظلہ العالی اپنے قلم مبارک سے اپنے اور جناب مفتی صاحب کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

تحریر مسائل

> اس کے بعد بدستور سابق مسائل کا جواب لکھنا اور روانہ کرنا اور تصنیف وتالیف کا اہتمام کرنا سب کی بجا آوری کرتا تھا۔ جو مسائل بلاد مختلفہ سے بکثرت آتے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ ان سب کا جواب میں لکھتا۔ اور جناب کو اس قدر میرے حالات پر اطمینان ہوگیا تھا کہ بعض مسائل کے جوابات سن لیا کرتے تھے اور بعض پر صرف میرے اعتماد پر مہر کرکے روانہ کردینے کا حکم دے دیا کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔ (گویا جناب مفتی صاحب کا اجتہاد جناب نجم العلماء کی رائے کا تابع ہوگیا تھا۔ مجیب)
>
> اور جب میں اپنے وطن امروہہ جاتا تھا تو جناب مرحوم مسائل واردہ جمع کرکے بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیج دیتے تھے۔ اور جب میں جواب روانہ کرتا تھا اپنی مہر ثبت کرکے روانہ فرمادیا کرتے تھے۔

(انتہی بقدر الحاجت مع حذف بعض العبارات)

کیوں جناب؟ جو کچھ حضرت نجم الملۃ نے تحریر فرمایا، اس کی صداقت میں تو نہ آپ کو کلام ہے نہ ہمیں کوئی شبہ۔ مگر کیا جناب عالی اس عبارت سے ہمارے استدلال کو صحیح مان لیں گے

کہ جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ جوابات مسائل تحریر نہ فرما سکتے تھے۔ یا کم از کم اتنا کہ جناب نجم العلماء کو مہارت زائد تھی۔ بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ جناب نجم الملۃ ہرگز بھی کوئی ایسا اشارہ یا کنایہ نہ فرماتے ہوں گے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ مسائل کے جوابات جناب مفتی صاحب کے تحریر فرمودہ نہیں ہیں بلکہ جناب نجم الملۃ کے نوشتہ قلم ہیں۔ لہٰذا بعینہ وہی صورت اور نسبت جناب نجم الملۃ اور جناب مفتی صاحب میں موجود ہے جو جناب سید العلماءؒ یا سلطان العلماؒ اور جناب مفتی صاحب میں قائم تھی۔ لہٰذا لازم تو یہی ہے کہ جو کچھ آپ مفتی صاحب کی خطوط نویسی کی وجہ سے سلطان العلماء کے متعلق ارشاد کریں بعینہ وہی نجم العلماء کی جواب نویسی کی وجہ سے جناب مفتی صاحب کے متعلق قبول فرمائیں۔ بلکہ جواب خطوط میں وہ اہمیت نہیں ہے جو جواب مسائل میں ہے۔ لہٰذا جب ایسی اہم خدمت دوسرے کے سپرد کر کے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، تو کیا جواب خطوط کی خدمت باوجود قدرت کسی غیر کو تفویض نہیں کی جا سکتی؟ اور اگر یہ مسلم ہی ہے کہ بسبب ادبی کمزوری کے جناب سلطان العلما ان خطوط کے جوابات مفتی صاحب سے لکھواتے تھے تو ادبی کمزوری اس قدر قابل گرفت نہیں ہے جتنی اڈّعائے اجتہاد کرنے کے بعد فقہی کمزوری عاجلاً اور اجلاً قابل گرفت ہو سکتی ہے لہٰذا جو جواب جناب عالی تجلیات کی مندرجہ بالا عبارت کا تجویز فرمائیں وہی جواب بعینہٖ ہمارا بھی ہے۔

اور اگر آپ کو ضد ہے کہ نہیں ان حضرات کی انشاء پردازی کا ثبوت دو، تو ملاحظہ ہو اپنے ممدوح کے رقم فرمودہ اوراق الذہب جناب مفتی صاحب اپنے استاد جناب سید العلماءؒ کی غزارت علوم میں ارشاد فرماتے ہیں:-

واما العربیة والادب فھو یتکلم بل العرب کلاماً احلی من الضرب ویحاور افحاحھا بما یقضی العجب ویساتیک دلائل ھذا المطلب فی فصل الخطب۔ عربیة

اور ادب میں وہ بے نظیر تھے اور ایسی با محاورہ عربی ارشاد فرماتے تھے کہ جیسے کوئی خاص اہل زبان بولتا ہے جو شہد سے زائد شیریں ہوتی تھی اور ایسے خالص محاورہ میں استعمال کرتے تھے کہ جو عرب الاعراب کا مثل ہوتے تھے اور سننے والے متعجب ہو کر رہ جاتے تھے۔ اور اس کا ثبوت ان جناب کے خطب کے تذکرہ میں ملے گا۔

آگے بڑھ کر جناب مفتی صاحب جناب سید العلماء کی ادبیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

ومن ذالک ماقال وھو یذکر ارتحال اخیہ الوجیہ السید مھدی الی دار النعیم وانہ ترک ولدہ السید ھادی طفلا قریاہ جدہ ثم ھو فی حجر التربیتہ والتعلیم من قولہ و قد خلف اخی المرحوم ھذا الدر الیتیم وھو ابن نحو من ثلث سنین الی آخرہ وھو من الطف العیاثر ولہ ماعداہ من جواھر زواھر قد ادرجتھا فی رسالتی الاجازہ وھو دون مرتبۃ من النبالہ والغزازہ۔

اور ان کے ادیب بے نظیر ہونے کے ثبوت میں ایک وہ عبارت بھی ہے جس میں جناب سید العلماء نے اپنے بھائی جناب سید مہدی صاحب کے انتقال فرمانے اور ان کے فرزند خورد سال جناب سید ہادی صاحب کی تربیت و تعلیم کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ جناب موصوف فرماتے ہیں کہ برادر مرحوم نے اس دریتیم کو چھوڑا جو کہ تین سال کے قریب ہے۔ الخ جناب مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ لطیف ترین عبارت ہے اور جناب سید العلماء کی اس کے علاوہ اور بھی عبارتیں ہیں جو ادبیت کا بہترین نمونہ ہیں اور میں نے ان عبارات کو اپنے رسالہ اجازہ میں جمع کیا ہے اور یہ عبارت اگرچہ اعلیٰ ترین افراد ادبیت ہیں۔ مگر ان کے علم و فضل کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ دوسروں کے واسطے چاہے سبب فخر ہوئیں مگر ان کے واسطے

کچھ بھی نہیں۔

بلکہ اس کے علاوہ خود جناب مفتی صاحب مرحوم نے ایسے ضدی طبائع کے واسطے اوراق الذہب میں حسب ذیل الفاظ تحریر فرمائے ہیں:-

الم یکفک فی الدلیل عبدہ الفقیر الذلیل وانہ کالملک الضلیل وھوایۃ من ایاتہ وروایۃ من روایاتہ۔ یعنی اگر تم ان کی ادبیت کا حال ہی معلوم کرنا چاہتے ہو تو کیا جناب سید العلماء کا یہ عبد ذلیل ان کی ادبیت کے ثبوت میں کافی نہیں ہے۔ کہ میں ان کی علامات ادبیت میں سے ایک علامت اور ان کے نشانوں میں سے ایک نشان ہوں۔

اب تو شاید جناب مفتی صاحب کے اس اعتراف کے بعد کہ میری ادبیت جناب سید العلماء کے آثار ادبیت سے ہے، مؤلّفِ تجلیات کو بھی اس کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ جناب سید العلماء کی ادبیت پر حملہ کریں۔ کیونکہ اگر مفتی صاحب کی ادبیت جناب سید العلماء کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ نہ تھی تو اپنی ذات کو ان کے آثار ادبیت میں پیش کرنا بے محل ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہم نے جو دعویٰ کیا تھا کہ مفتی صاحب کو ادبیت بھی خاندان اجتہاد کی تعلیم سے آئی اس کا خود جناب مفتی صاحب کو اعتراف و اقرار تھا۔

اس کے علاوہ اگر ہم چاہیں تو جناب سلطان العلماء اور جناب سید العلماء کے بہترین عبارات عربیہ ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر تلامذہ کے مقابلہ میں اساتذہ کے عبارات پیش کرنا اور خصوصاً اس وقت جب خود ممدوح تجلیات ہی کو ان کی ادبیت کا اعتراف ہو، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے ہم ان کو ترک کرتے ہیں۔

ہمارے مندرجہ بالا ثبوت کے بعد شاید کوئی شخص اس دعوے کو صحیح نہیں تسلیم کر سکتا کہ خطوط عراق کا جواب دینے والا لکھنؤ کیسا بلکہ ہندوستان میں کوئی نہ تھا اور معاذاللہ علمائے خاندان اجتہاد جناب مفتی صاحب سے جوابات اس لئے لکھواتے تھے کہ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر جناب سید العلماء اور جناب سلطان العلماء جواب تحریر فرماتے تو وہ بدرجہا مفتی صاحب کے لکھے ہوئے جوابات سے بہتر ہوتے مگر چونکہ انشا پردازی اور جوابات خطوط لکھنے سے زائد اہم امور کی انجام دہی ان حضرات کے متعلق تھی، اس وجہ سے یہ خدمت جناب مفتی صاحب کے سپرد کی گئی۔

چوتھا وسوسہ اور اس کا جواب

یہ خیال جو ضمن الفاظ میں بالمفہوم ظاہر کیا گیا ہے کہ علماء عراق کے خطوط بنام علمائے خاندان اجتہاد ان کے وقار علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے نہ تھے بلکہ عطیات شاہی ان خطوط کا جالب اور سبب تھا یہ بھی لغو اور بے اصل ہے۔ کیونکہ اس میں علمائے عراق کی نیّت پر ایک زبردست حملہ ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ حضرات ان عطیات کی وجہ سے برابر خطوط لکھا کرتے تھے۔ اور سب سے زائد ان خطوط کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ خیال قائم کرنا بالکل ہی دیانت کے خلاف ہے، خصوصاً وہ خط جس میں بعض علماء عراق نے جناب مفتی صاحب کے خطوط اشتیاق زیارات عتبات عالیات کے جواب میں تحریر کیا ہے کہ جناب سید العلماء اور سلطان العلماء کی خدمت میں حاضری آپ کے واسطے زیارات عتبات عالیات نہ کرنے کی تلافی کردے گا۔ اور اس خط کی عبارت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جناب مفتی صاحب نے قبر جناب سید العلماء پر کھڑے ہو کر یہ رباعی ارشاد فرمائی ؎

بشنو چه بکاء و شور و شین است اینجا
چشمے بکشا ضیاء عین است اینجا
سال فوتش زروئے اخلاص بخوان
یعنی که زیارت حسینؑ است اینجا

ملاحظہ ہو اوراق الذہب:

اگر کوئی ان خطوط کو دیکھنے کے بعد بھی یہ کہے کہ یہ سب محض

عطیات شاہی کی وجہ سے تھا تو شاید علمائے عراق کو معاذ اللہ لالچی اور بد دیانت خیال کرنا بے جا نہ ہوگا، جس کی جرأت ہم تو نہیں کر سکتے مؤلف تجلّیات یہ جرأت فرمائیں تو فرمائیں۔

مگر لطف یہ ہے کہ یہی ایک جملہ کہ خطوط کی وجہ عطیات شاہی تھے، ہمارے واسطے ایک جہت سے مفید بھی ہوا۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ عراق کے خطوط عطیات شاہی کے سبب سے آتے تھے تو پھر مؤلف کا یہ جملہ کہ مفتی صاحب کی وجہ سے علماء خاندان اجتہاد کی عظمت علمائے عراق کی نظر میں قائم ہوئی ہے، بے اصل ہوا جاتا ہے۔ چنانچہ مؤلف تجلیات صفحہ ۵۷ پر تحریر فرماتے ہیں:-

ان تحریرات مفتی صاحب کے جوابات نے ہندوستان کا نام عرب وعجم میں روشن کر دیا اور خاندان اجتہاد کی عظمت علمائے عراق کی نظر میں دوبالا کر دی''

اس کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ایسے ہی مطالب دہرائے گئے ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہے کہ عطیات شاہی کی وجہ سے عراق کے خطوط آتے تھے۔ تو پھر یہ ماننا ہوگا کہ خاندان اجتہاد کی عظمت عطیات شاہی نے قائم کی مفتی صاحب کو اس عظمت میں کوئی مدخلیت نہ تھی۔

دوسرے یہ کہ جواب کی لفظ یہ ثابت کرتی ہے کہ خطوطِ عراق مقدم تھے یعنی پہلے عراق کے خطوط آتے تھے اس وقت ان کے جواب کی خدمت مفتی صاحب کے سپرد ہوتی تھی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علمائے خاندان اجتہاد کی عظمت مفتی صاحب کے جوابات لکھنے سے پہلے ہی علمائے عراق کی نظر میں اس قدر موجود تھی کہ ان حضرات نے خطوط نویسی میں ابتدا کی۔ اس لئے یہ کہنا کہ مفتی صاحب نے ہندوستان کا نام روشن کیا اور علمائے ہند کی عظمت قائم کی بے بنیاد و بے اصل ہے کیونکہ عطیات شاہی کی وجہ سے ہو یا خدمات دینی کے سبب سے ہو، لیکن یہ بہرحال مسلم ہے کہ مفتی صاحب کے خطوط سے پہلے ہندوستان کا نام عراق میں روشن اور علمائے خاندان اجتہاد کا وقار موجود تھا۔

پانچواں وسوسہ اور اس کا جواب

رہا یہ امر کہ جو جواب مفتی صاحب علمائے خاندان اجتہاد کی طرف سے بنام علمائے عراق تحریر فرماتے تھے، اس میں کبھی اپنے نام کا ایما تک نہ کیا، ایسا ہی پادر ہوا اور ذکر بے محل ہے جیسے تجلیات کے اکثر اور بیشتر مطالب، کیونکہ اپنے نام کا ایما نہ کرنا اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ کو نام ونمود کا شوق نہ تھا، کیونکہ بعض اوقات خود جناب مفتی صاحب نے فرمائش کر کے اپنا نام وسلام خطوط علمائے عراق میں لکھوایا ہے اور تعارف کے متمنی ہوئے۔ چنانچہ جناب مفتی صاحب کے منتہائے کمال پر پہنچنے کے بعد کا واقعہ ہے کہ جناب ممتاز العلما جنّت مآب اعلی اللہ مقامہ کے ذریعہ سے آپ نے علمائے عراق کو سلام لکھوایا ہے۔ جناب موصوف نے اپنے اس خط میں جو بنام علامہ نجفی مؤلف جوھر الکلام تحریر فرمایا تھا۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

ثم ان السید الجلیل و الفاضل النبیل الادیب الاریب الحسیب النسیب الالمعی السید محمد عباس التستری یسلم علی جنابک العلی وینحف الیک تحف تحیات تتری الی مدی الزمان لا تنقضی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ نام نہ لکھنا اس وجہ سے نہ تھا کہ نمود سے سروکار نہ تھا بلکہ اس کی وجہ حقیقی یہ تھی کہ جس طرح کتاب مملکت اور منشیان دربار شاہی کو حق نہیں ہوتا کہ وہ دستخط شاہی کے علاوہ اپنے نام کا اضافہ کریں، اسی طرح جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ بھی کوئی حق نہ رکھتے تھے کہ اپنا نام تحریر کریں۔ اس کے علاوہ ہم سابقاً ذکر کر چکے کہ اکثر خطوط میں املا سلطان العلماء اور سید العلماء کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور صرف کتابت جناب مفتی صاحب کے قلم سے ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں بدرجہ اولیٰ جناب مفتی صاحب کو اپنے نام کے ایما کا محل موجود نہ تھا۔

جناب مفتی صاحب کی ادبی قابلیت کے ثبوت میں مؤلفِ

تجلیات نے بعض مقامات پر علمائے خاندان اجتہاد پر بالکل کھلے ہوئے حملے کرنا بھی اپنا فرض عین سمجھا ہے۔ چنانچہ آپ تجلّیات کے صفحہ (۲۱۹) میں ارشاد فرماتے ہیں:-

اگر چہ ممدوح حضرت سید العلماء کے گروہ تلامذہ میں تھے اور اس پر ان کو فخر بھی تھا لیکن یہ کہنا سوئے ادب نہ ہوگا کہ اس علم میں وہ بھی جناب مفتی صاحب کے حاجت مند تھے۔

اس عبارت میں انتہائی بے ادبی کو 'سوئے ادب نہ ہوگا' کے جملے سے ڈھانک کر نہایت درجہ غلط بیانی اور یاوہ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم اپنے گذشتہ بیانات میں یہ امر بخوبی واضح کر چکے کہ جناب مفتی صاحب کو خود اس کا اقرار تھا کہ ان کے تمام کمال ادبیت کا منبع فیض بھی سید العلماء سے الگ نہ تھا۔ لہٰذا یا تو جناب مفتی صاحب نے غلط بیانی کی، جو ہمارے ماننے کے قابل ہرگز نہیں اور یا مؤلّف تجلیات نے احتیاج ثابت کرنے میں اس کا لحاظ نہ رکھا کہ میرا بیان جناب مفتی صاحب کے بیان سے معارض ہے اور ان کی تکذیب کرتا ہے۔ ع

"بریں عقل و دانش بباید گریست"

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں اور جو مشکلات اور مراحل علوم ادبیہ کے متعلق پیش آجاتے تھے ان میں علمائے کبار کا مرجع اسی ادیب فقید المثال کی ذات ہوتی تھی۔ چنانچہ کسی ایسے ہی موقع پر سلطان العلماء کے سے علامہ بے نظیر نے ایک خط مفتی صاحب کو لکھا جس کی ابتدا اس طرح سے کی تھی:-

"یا حضرت عباسؑ وقت مدد ہے"

کاش اس سب کے بعد مولف محترم نے کوئی ایک ہی واقعہ ایسا لکھا ہوتا جس میں جناب سید العلماء کی مفتی صاحب کی طرف رجوع کرنے کی کوئی دلیل نظر آتی اور ہم بھی ٹھنڈے دل سے غور کرتے کہ کلام مؤلف کہاں تک قابل تسلیم ہے، مگر صرف دعویٰ کر کے دلیل سے روگردانی کرنا ہر صاحب عقل کو یہ بتادینے میں کافی ہے کہ صداقت دامن تجلیات سے کس قدر دور ہے۔

ہم نے عبارت تجلیات بلفظہ ہدیہ ناظرین کردی۔ ہم کو یقین ہے کہ ہماری حقیقت کو بے نقاب کرنے سے پہلے الفاظ کی کمزوری دیکھ کر ہر شخص سمجھ گیا ہوگا کہ اصل امر کچھ اور ہی تھا۔ جسے پردہ میں رکھ کر اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ کسی ایسے ہی موقع کا مجمل جملہ یہ بتانے کو کافی ہے کہ نہ وہ خط مولف کی نظر سے گذرا اور نہ واقعہ سمع مبارک مؤلف تک پہنچا بلکہ صرف قیاس عقلی میں مقدمات وہمیہ کے سہارے سے نتیجہ نکال لیا گیا۔

لیکن کاش نتیجہ نکالنے سے پہلے جناب عزیزؔ یا محرک تالیف تجلیات نے جناب جدی العلام مولانا سید علی اکبر صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی وہ تالیف ملاحظہ فرمائی ہوتی جس میں جناب موصوف نے اپنے والد علام حضرت سلطان العلماء کے مختصر حالات زندگی کو جمع فرمایا ہے، اور کتاب طبع بھی ہوچکی ہے، تو جناب مؤلف کو معلوم ہوجاتا کہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ ایک شخص نے جناب سلطان العلماء سے استدعا کی تھی کہ وہ جناب اس عرضی پر جو بنام مفتی صاحب متدعی نے لکھی ہے، سفارش فرمادیں۔ چنانچہ جناب سلطان العلماء نے مندرجہ بالا مصرع اسی عرضی پر لکھ کے سفارش فرمادی۔ یہ واقعہ کی اصل تھی جسے مؤلف نے گھما پھرا کر دروغ بیانی کا ارتکاب کیا۔ بلکہ اس سے بھی زائد ناظرین کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ خود جناب عزیزؔ بھی اس واقعہ کی اصل سے جاہل نہ تھے، کیونکہ مدرسۃ الواعظین کا یہ علمی رسالہ الواعظ جو خود جناب عزیزؔ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اس کی جلد ۲ نمبر ۵ بابت جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ میں حالات جناب سلطان العلماء شائع فرماتے ہوئے جناب عزیزؔ لکھتے ہیں:

"ایک روز کسی نے عرضی پیش کی کہ اس پر آپ جناب مفتی صاحب سے سفارش کرادیں آپ نے (یعنی سلطان العلماء نے) اس کی پیشانی پر لکھ دیا:

یا حضرت عباسؑ علیؑ وقت مدد ہے۔‘‘

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ الواعظ میں واقعہ کو اصلی صورت میں پیش کرنے کے بعد مؤلف کو کس جذبہ نے مجبور کیا کہ انھوں نے تجلیات میں ایسے کذب صریح کا ارتکاب کیا۔

اس کے بعد مؤلف لکھتے ہیں کہ:-

جناب سلطان العلماء کا لفظ از دیار کی صحت میں شک کرنا، لفظ فاق کا متعدی بہ علی ہونے کی سند کا استشہاد کرنا۔

مجمل الفاظ میں ادائے مطلب مؤلف کا طرز خاص ہے اور واقعات کو کسی نہ کسی طرح اپنے موافق بنانے میں مفید بھی ہے، اس لئے ہمیں کوئی شکایت بھی نہیں، لیکن نہیں اس جملہ پر ایک حاشیہ ہے، جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

جناب سلطان العلماء کو ایک مرتبہ شک ہوا کہ لفظ از دیار صحیح نہیں ہے اور مطلع کرنے کے بعد بھی شک رہا اور سبب اس کا یہ تھا کہ لفظ مذکور قاموس میں نہ ملا، حالانکہ صحاح و اساس ومتنبیٰ، تبیان میں موجود تھا اور قاموس میں موجود نہ ہونا، عدم کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا لفظ مذکور کے اسناد مفتی صاحب قبلہ نے ایک جگہ جمع کرکے یہ عبارت تحریر فرمائی۔

اس کے بعد مؤلّف نے جناب مفتی صاحب سے عربی عبارت نقل کی ہے جس کے ترجمہ کا خلاصہ وہی عبارت ہے جو اوپر نقل کی گئی صرف شواہد اصل عبارت عربی میں زائد ہیں۔ اس عبارت کے دیکھنے کے بعد بھی چند باتیں پوشیدہ ہی رہیں:-

(۱) واقعہ کی تفصیل کیا تھی اور کیوں لفظ از دیاد کی صحت و عدم صحت کی جستجو کی گئی؟

(۲) جناب مفتی صاحب نے اس قدر تو ضرور تحریر فرمایا کہ بعد تنبیہ بھی سلطان العلماء کو صحت لفظ از دیاد میں شک باقی رہا۔ مگر اس کی توضیح نہ جناب مفتی صاحب نے کی اور نہ جناب مؤلف نے کہ تنبیہ کس نے کی۔

(۳) جو الفاظ عبارت جناب مفتی صاحب کے حاشیہ تجلیات میں نقل کئے گئے ہیں، اس میں کہیں اس کی تصریح نہیں ہے کہ جناب مفتی صاحب نے عبارت مندرجہ حاشیہ تجلیات تحریر فرما کے سلطان العلماء کی خدمت میں پیش فرمائی یا صرف اس دن کے واسطے ذخیرہ کرلی کہ ایک دن تجلیات میں شائع کی جائے بلکہ مؤلف تجلیات نے یہ تک لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ یہ عبارت بعینہ جناب مفتی صاحب کی تحریر کردہ جناب مؤلف کو دستیاب ہوگئی تھی یا محض کسی کی قوت حافظہ نے عبارت کی نقل مذکورۂ اوراق دماغ سے نقل کرادی۔ جب تک ان تمام واقعات کی توضیح وتشریح نہ ہوجائے، اس وقت تک ہمیں یہ قبول کرنے میں تامل ہے کہ جناب مفتی صاحب مرحوم نے ایک ایسا ناقابل قبول عقلاء واقعہ اپنے قلم مبارک سے لکھ کر مؤلف کے واسطے ذخیرہ کیا ہوگا، کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہاں تک تو قرین عقل ہے کہ کسی لفظ کی صحت میں کوئی شخص شک کرے مگر بعد تنبیہ بھی سلطان العلماء کا سا عالم بزرگ صرف قاموس میں نہ پانے کی وجہ سے اپنے شک پر باقی رہے۔

ہماری عقل سے باہر ہے اور پھر صحاح و آساس متنبی و تبیان نہ ایسی کتابیں ہیں جن کے متعلق کوئی نافہم بھی دعویٰ کرسکے کہ سلطان العلماءؒ ان کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ اور نہ ایسی نایاب ہی ہیں کہ جناب مفتی صاحب کے علاوہ کسی اور کے کتب خانے میں موجود نہ ہوں۔ مذکورۂ بالا ثبوت کی بنا پر تو میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر جناب مفتی صاحب کے قلم مبارک کی لکھی ہوئی اصل عبارت بھی ثبوت میں پیش کردی جائے تو ہم عبارت کے ذیل و سباق اول و آخر پر نظر کئے بغیر واقعہ کو صحیح سمجھنے میں تامل کریں گے۔ کیوں کہ سلطان العلماء وہ بزرگ تھے جن کے متعلق میں ہی نہیں بلکہ خود جناب مفتی صاحب اس کے مقر تھے کہ وہ محض سلطان العلماء نہ تھے کہ دربار شاہی سے یہ لقب عطا ہوا تھا، بلکہ فی الحقیقت بھی اس لقب کے مصداق صحیح تھے۔ البتہ

جناب مفتی صاحب کی عبارت مندرجہ حاشیہ کو اگر ہم مان لیں کہ انہیں جناب کی عبارت ہے، تو جہاں تک ہماری عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ وہ دو احتمالوں سے زائد نہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ممکن ہے کہ کسی اور شخص نے جناب سلطان العلماء کے متعلق یہ واقعہ جناب مفتی صاحب سے بیان کیا ہو کہ سلطان العلماء کو اس لفظ کی صحت میں شک ہوا اور جناب مفتی صاحب نے اس ناقل کی تکذیب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ **العجب کل العجب** کہاں سلطان العلماء اور کہاں یہ شبہ۔ یہ تو فلاں فلاں کتاب میں موجود ہے۔ بھلا سلطان العلماء اس میں کیا شک کریں گے! اور مؤلّف نے اس واقعہ کو اس طرح پیش کیا جو تجلیات میں موجود ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر احتمال اس خیال میں منحصر ہے کہ کسی شخص نے سلطان العلماء کے متعلق جناب مفتی صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور آپ نے بطور یادداشت مع اسناد لفظ از دیاد کے تحریر کرلیا کیونکہ نہ جناب مفتی صاحب یہ تحریر فرماتے ہیں کہ میرے سامنے یہ واقعہ پیش آیا اور نہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے لفظ از دیار کی صحت پر تنبیہ کی اور نہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس لفظ کے اسناد میں نے جناب سلطان العلماء کی خدمت میں پیش کئے انہی وجوہ واسباب کی بنا پر ہم مندرجہ بالا احتمال سے زائد کچھ اور تسلیم کرنے کے واسطے تیار نہیں ہیں۔

اس مذکورۂ بالا جملہ سے ملا کے مؤلف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جناب سلطان العلماء نے لفظ فاق کے متعدی بہ علی ہونے کے ثبوت میں سند کا استشہاد جناب مفتی صاحب سے کیا۔ ہمیں تعجب ہے کہ ایک ایسی کتاب میں جسے ایک عالم مستند کے حالات کا ذخیرہ باقی اور ہمیشگی یادگار قرار دینے کی سعی کی گئی ہے، ایسی صاف دھوکہ دہی سے کام لے کر تالیف کی وقعت کیوں گھٹائی گئی اور مؤلف محترم کو کس خاص ولولہ نے مجبور کیا کہ وہ زبردستی واقعات میں قطع و برید کر کے اپنا مطلب حقیقی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر مندرجہ بالا واقعات بلفظہ صحیح اور درست بھی ہوتے، تب بھی ان کی اشاعت ان معنوں سے تجلیات کا جز اہم نہیں ہوسکتی کہ جناب سلطان العلماء تمام فضائل وکمالات علمی ونفسی کے بعد بھی انسان تھے اور خطا انسان ہی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی مقام پر کوئی غلطی ہوگئی ہوتی یا کسی لفظ میں کوئی شبہ پیدا ہوتا تو بھی نہ اس لائق تھا کہ ان کی فضیلت میں کمی پیدا کرتا اور نہ اس لائق تھا کہ تجلیات کی عظمت بڑھا سکتا بلکہ ہمیں اس بات میں تعجب ہوئے بغیر نہ رہے گا کہ جناب مفتی صاحب کے سے پاک نفس بزرگ نے اپنی یادداشت میں ایسی چیزوں کو ذخیرہ رکھنا کیوں ضروری سمجھا۔ چہ جائیکہ حقیقت امر کچھ اور ہو اور اسے پیش کیا جائے۔ کسی دوسرے لباس میں۔ خیر لفظ از دیار میں شبہ کے متعلق تو عبارت جناب مفتی صاحب سے بھی ایک صورت اشتباہ منجملہ دیگر صورت مقصود ہوسکتی ہے۔ مگر لفظ فاق کے تعدیہ میں تو نہ سلطان العلماء کی غلطی ثابت ہوتی ہے، نہ ان جناب کا مفتی صاحب پر اعتماد و استناد معلوم ہوتا ہے کیونکہ لفظ فاق کے متعدی بہ علی ہونے کا جو واقعہ خود مؤلف کتاب نے حاشیہ کتاب میں لکھا ہے، وہ صرف اس قدر کہ جناب سلطان العلماء نے کسی اجازہ میں لفظ فاق کا متعدی بہ علی سے تحریر فرمایا تھا اور کسی مدعی عربیت نے اس پر اعتراض کر دیا کہ یہ تعدیہ غلط ہے۔ مؤلّف لکھتے ہیں کہ ''جناب ممدوح (یعنی سلطان العلماء) نے مفتی صاحب کو لکھا''، مگر اجمال سے فائدہ اٹھانے کے واسطے مؤلف نے یہ تحریر فرمانا مناسب نہ جانا کہ کیا لکھا؟ آیا محض بیان واقعہ کسی تذکرہ کے ضمن میں فرمایا، یا نصرت طلب کی یا اس تعدیہ کی صحت دریافت کی یا صحت مسلم ہونے کے بعد امثلہ تلاش فرمانے کا حکم دیا۔ یہ تمام احتمالات صرف اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ عبارت میں اجمال مدنظر رکھا گیا بلکہ اگر جناب مفتی صاحب کی وہ عبارت جس میں جناب ممدوح نے سلطان العلماء کا تحریر فرمانا ذکر کیا ہو منظر عام پر پیش نہ کی گئی تو ہم یہ یقین کر لینے پر مجبور ہوں گے کہ جس طرح اور واقعات میں اکثر مقدمات محض اختراع قیاس و وہم تھے اسی

طرح اس واقعہ میں بھی مؤلف نے لفظ فاق کے متعدی بہ علی ہونے کے صرف شواہد جناب مفتی صاحب کی تحریر میں پا کے یہ قیاس کرلیا کہ سلطان العلماء نے یوں لکھا تھا، اس کی بنا پر جناب مفتی صاحب نے یہ شواہد جمع فرمائے ہوں گے۔ اور یہ خیال ہمیں اس بنا پر پیدا ہوا کہ جناب مفتی صاحب کی جو عبارت تجلیات کے حاشیہ میں نقل کی گئی ہے۔ اس میں صرف لفظ فاق کے متعدی بہ علی ہونے کے شواہد مذکور ہیں۔مگر یہ مندرج نہیں ہے کہ جناب مفتی صاحب نے یہ شواہد کیوں جمع فرمائے اور کس کی فرمائش سے جمع کئے۔ البتہ مؤلّف نے اپنی تحریر میں ظاہر کیا ہے کہ یہ شواہد مفتی صاحب نے اس وجہ سے جمع فرمائے تھے کہ سلطان العلماء پر کسی نے اعتراض کیا اور ان جناب نے مفتی صاحب سے شواہد جمع کرنے کی فرمائش کی تھی اور اس سب کے بعد یہ کہ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ دراصل ایسا ہی ہوا تھا کہ جناب مفتی صاحب کو سلطان العلماء نے لکھا تھا کہ فلاں شخص نے مجھ پر اعتراض کیا ہے لہٰذا تم اس کا جواب دو، تو نہ اس میں جناب سلطان العلماء کی کوئی منقصت نکلتی ہے اور نہ جناب مفتی صاحب کے واسطے کوئی فضیلت خاصہ، کیونکہ یہ خیال کسی صحیح دماغ میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا کہ جناب سلطان العلماء یا ان کے صاحبزادوں میں سے کوئی شخص اس قابل نہ تھا کہ وہ کتب معتبرہ اہل عربیت سے اس تعدیہ کے شواہد تلاش کر سکتا کیونکہ یہ کوئی امر اہم نہ تھا لہٰذا اگر یہ خدمت جناب مفتی کے سپرد کی گئی تھی تو صرف اس وجہ سے کہ ایسے معمولی کام اکثر اساتذہ اپنے شاگردوں کے سپرد کرتے ہیں، محض اس وجہ سے کہ اتنے معمولی کاموں میں وقت صرف کرنے کی مہلت نہیں ہوتی اور نیز یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ شاگرد کی قابلیت کا امتحان اور اس کی مہارت علمی میں زیادتی ہو۔

اس کے بعد جناب مؤلّف واقعہ مندرجہ بالا کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

ان (یعنی جناب سلطان العلماء) کے بعض صاحبزادوں نے اس کی سند مفتی صاحب سے طلب کی کہ اپنا کلام تحریر فرمائیں۔

اس عبارت میں بھی عادت نے مطلب کو مجمل رکھنے پر مجبور کیا اور جناب مؤلف نے یہ نہ کہا کہ جناب سلطان العلماء کے صاحبزادوں میں سے کس نے یہ خدمت جناب مفتی صاحب کے سپرد کی لیکن تاہم اس عبارت سے اتنا ضرور واضح ہوگیا کہ جناب سلطان العلماء نے مفتی صاحب کو ہرگز بھی یہ نہ لکھا تھا کہ لفظ فاق کے متعدی بہ علی ہونے کے شواہد پیش کریں، کیونکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو باپ کے حکم دینے کے بعد صاحبزادوں کی فرمائش کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ سلطان العلماء نے شواہد طلب نہیں فرمائے تھے بلکہ اگر فرمائش کی تھی تو ان کے صاحبزادوں نے۔ اس لئے ہر بافہم ناظر یہ سمجھ سکتا ہے کہ مؤلف نے اس مقام پر صریح دھوکا دہی سے کام لیا کیونکہ اصل کتاب میں مؤلف فرماتے ہیں کہ جناب سلطان العلماء نے شواہد طلب کئے اور حاشیہ پر واقعہ کی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جناب سلطان العلماء کے بعض صاحبزادوں نے سند طلب کی، جس کے نتیجہ میں ہمیں یہ کہنا ناگزیر ہے کہ ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد''۔ صاحبزادے کے متعلق مؤلف نے یہ لکھا ہے کہ انھوں نے جناب مفتی صاحب سے لفظ فاق کے متعدی بہ علی ہونے کے شواہد خود جناب مفتی صاحب کے کلام سے طلب کئے۔ اس میں بھی ہمیں ان معنوں سے شک کرنے کا محل باقی ہے کہ جس مدعی عربیت نے اعتراض کیا تھا اس کے مقابلہ میں جناب مفتی صاحب کا کلام پیش کیا جانا مفید نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسے مقامات پر کسی مسلم الثبوت عرب کا کلام پیش کیا جانا سکوت معترض کا سبب ہوسکتا ہے، نہ کہ جناب مفتی صاحب کا کلام جس کے متعلق معترض کا انکار کردینا یقینا قابلِ قبول تھا۔

(جاری)